عصری علوم پر دینی مدارس کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

The Impact of Religious Seminaries on Modern Sciences

• محمد حمزہ
ریسرچ اسکالر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ABSTRACT:

Religious seminaries have always their own impact on society. Their role is not only confined to some rituals but they cover a wide range of activities of the society. Academic and scientific studies and research is also influenced by religious scholars and seminaries. These seminaries produce not only religious scholars but also scholars of modern and social sciences. In present days we can find a good number of scholars who belong to religious seminaries and they have also produced worthwhile research oriented publications. Their impacts on their relevant fields of studies are remarkable. In Muslim world teachers and scholars from religious seminaries are providing their services to the institutions of higher education like colleges and universities. This article is an overview of the impact of such scholars on society in general and on specific fields of study in particular.

دینی مدارس کے سماجی کردار اور ان میں دی جانے والی تعلیم کے اثرات کے بارے میں حکومت اور معاشرہ دونوں تذبذب اور تشکیک میں مبتلا ہیں۔ اربابِ اقتدار ایک ہی سانس میں ان کی معاشرتی خدمات اور اثرات کی تعریف کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی چار دیواری سے دہشت گرد برآمد کرتے ہیں۔ معاشرے کے صاحبانِ وسائل اور عام افراد، دونوں ان اداروں کے سماجی رویے کے شاکی ہیں لیکن ساتھ ہی مذہبی معاملات میں ان مدارس کے فارغ التحصیل اہل علم کی آرا کو مستند خیال کرتے اور اس حوالے سے ان ہی کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح وہ ان کے وجود کو اپنی دینی ضرورت سمجھتے ہوئے ان کی آبادی اور توسیع کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں۔اس وقت ہمیں اس معاملے کو صرف دینی حوالے ہی سے نہیں، سماجی اعتبار سے بھی سمجھنا ہے کیونکہ دینی

مدارس کا وجود ہمارے معاشرتی ماحول پر بعض غیر معمولی اثرات مرتب کر رہا ہے۔ یہاں پر چند امور اگر بطور مقدمہ پیش نظر رہیں تو مسئلے کی تفہیم آسان ہو سکتی ہے۔

مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا تو بلا مبالغہ لاکھوں افراد مختلف حوالوں سے ان سے وابستہ ہو گئے۔ سماجیات کے عمومی اصولوں کے تحت ان کی حیثیت ایک بااثر طبقے کی ہو گئی اور پھر فطری نتیجے کے طور پر طبقاتی مفاد وجود میں آ گیا۔ اب ایک طرف کچھ لوگوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی کہ وہ اس طبقاتی مفاد کا دفاع کریں گے اور دوسری طرف وہ گروہ سامنے آئے جنہوں نے مدارس کی اس اجتماعی قوت سے اپنے دنیاوی اور مادی مفادات کی آبیاری کی۔ یہ گروہ ریاست اور سیاسی علما تھے۔

ریاست نے جس طرح ان مدارس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن جہادِ افغانستان، طالبانا ور جہادِ کشمیر شاید اس کے سب سے بڑے مظاہر ہیں۔(۱) یہ استعمال درست تھا یا غلط، یہ سوال اس تجزیے سے براہ راست متعلق نہیں، یہاں اس پہلو کو بطور امر واقعہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کس طرح ریاست نے اپنے مقاصد کے لیے اس اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھایا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی آمد کے بعد جو جنگ ہوئی، وہ گوریلا جنگ تھی۔ اس میں تربیت یافتہ فوج کے ساتھ، گوریلا کارروائیوں کے لیے مجاہدین کی ضرورت بھی تھی۔ پاکستانی ریاست کے اس اقدام کو مغربی دنیا کی بھرپور حمایت حاصل تھی کیونکہ مغرب اس معرکے میں سوویت یونین کی فیصلہ کن شکست کا آرزومند تھا۔ بعد میں جب پاکستان نے افغانستان میں ایک "پاکستان حامی" حکومت کا خواب دیکھا تو "طالبان" کو میدان میں اتارا گیا۔(۲)

کشمیر کا معاملہ یہ تھا کہ بعض بین الاقوامی پابندیوں اور بھارت کے ساتھ دوطرفہ معاہدوں کے باعث، ریاست کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ علانیہ کوئی اقدام کرے۔ ریاست نے اس کے لیے جو متبادل پالیسی بنائی، اس میں قرعہ فال پھر مدارس کے نام نکلا۔(۳)

بعض اہل علم نے کوشش کی کہ وہ اپنے مدارس کو سیاسی علماء کی دسترس سے محفوظ رکھ سکیں اور اپنا کردار حسبِ سابق ادا کرتے رہیں۔ یہ کردار روایتی دینی علم کا دفاع اور معاشرے کی دینی ضروریات کے لیے افراد کی فراہمی ہے۔ تاہم یہ ادارے اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ تمام مدارس حکومتِ وقت اور سیاسی اثر و رسوخ کی نذر ہو چکے ہیں۔ بعض مدارس اب بھی ایسے ہیں جو مکمل طور پر دین اور تعلیم کے حوالے سے اپنا واضح موقف رکھتے ہیں۔ ان مدارس میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ یہ

مدارس حکومت معاونت پر گزر بسر نہیں کرتے، ان کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے، طریقہ کار ہوتا ہے، نصاب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کے محتاج نہیں ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صرف گنے چنے مدارس ہی حکومتی امداد کے محتاج ہیں تو یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا۔ البتہ بعض ایسے موارد ضرور ہیں کہ جہاں یہ مدارس حکومتی اشارے پر چلتے ہیں اور پیسوں کے محتاج ہیں۔ جیسا کہ متن میں بتایا گیا کہ افغان جہاد کے دوران ان مدارس سے بھرپور مدد لی گئی اور جہاد کے نام پر مدارس کے طلاّب کو اس جنگ میں جھونکا گیا۔ البتہ اس حقیقت کے باوجود یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دینی مدارس کے بعض اکابرین نے ہمیشہ اپنی ساکھ، عزت اور انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض علماء تو روکھی سوکھی کھا کر بھی دینی تعلیم کے حصول کو اولیت دینا فرض سمجھتے تھے جیسا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کہتے ہیں:

> "ہم روکھی سوکھی کھائیں گے، زمین پر بیٹھ کر تعلیم لیں گے اور تعلیم دیں گے لیکن کسی سرکار سرپرستی حاصل نہیں کریں گے۔"(۴)

دینی مدارس کا نصاب جوہری طور پر مسلکی و گروہی ضروریات کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل علما معاشرے میں کسی خاص مسلک کے مبلغ کے طور پر سرگرم رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مساجد مسلکی اور فقہی بنیادوں پر منقسم ہیں۔

اس وقت دینی مدارس کی تعلیم اور ماحول سے معاشرے میں تقسیم کا عمل بہت گہرا ہو گیا ہے۔ ایک دینی مدرسے کا فارغ التحصیل یا طالب علم اپنے ظاہر، بود و باش، اطوار و عادات، معاشرتی رویے اور مشاغل کے اعتبار سے سماج کے دیگر طبقات سے یکسر مختلف دکھائی دیتا ہے۔ دینی مدارس کی اس روایت، سماجی کردار اور پاکستانی معاشرے کی دینی ضروریات کو پیش نظر رکھیں تو چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

ریاست اور سیاسی علما کے ہاتھوں دینی مدارس کے سوء استعمال کے بعد اب معاشرہ ان کے بارے میں ابہام اور تشکیک میں مبتلا ہے، تاہم وہ یہ بھی خیال کرتا ہے کہ معاشرے کی دینی ضروریات متقاضی ہیں کہ یہ نظام باقی رہے۔ معاشرے کی دینی ضروریات، اس وقت تین طرح کی ہیں:

اول:　بچوں کے لیے روزمرہ کی دینی تعلیم۔

دوم:　نکاح و طلاق، ولادت و موت، حضانت و وراثت جیسے مسائل میں دینی احکام سے آگاہی و تکمیل۔

سوم:　مساجد کا انتظام و انصرام۔

مدارسِ اسلامیہ کے اثرات کا تزویراتی جائزہ:

پاکستان میں عوامی نذرانے پر چلنے والے موجودہ شکل کے مدارس کی ابتدائی تحریک کا جائزہ لیجیے کہ کن اسباب و محرکات کے تحت اس نظام کے حامل مدارس کا آغاز ہوا؟ دراصل اس وقت بھی یہی صورت حال تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے زمام اقتدار چھن چکا تھا، انگریزی قوم یہاں کے ہر سیاہ و سفید کی مالک ہو چکی تھی، اگر انہیں مستقبل میں اپنے اور اپنے اس آمرانہ حکمرانی کے بیچ کوئی چیز سب سے بڑی رکاوٹ اور حائل نظر آرہی تھی تو وہ یہاں کی غیور، باحمیت اور زندہ دل مسلمانوں کی تھی، چونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ خست و ذلت سے نکال کر انھیں رفعت و بلندی کے اوجِ ثریا پر کوئی چیز پہونچا سکتی ہے تو وہ ہے، ان کا ایمان وایقان اور ان کی دینی حمیت۔ انہوں نے اس کے لیے حکومت کے ماتحت چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام میں حذف واضافہ شروع کر دیا، اس نصابِ تعلیم کی تبدیلی اور ترمیم کا راست اثر مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ پر ہو رہا تھا، وہ اپنی تہذیبی خصوصیات سے دستبردار ہو کر بحیثیت قوم مسلم کے اپنا وجود کھو رہے تھے، اس وقت بھی مدارس و مکاتب کی اسی تحریک ہی کے ذریعہ اسلام کا بچاؤ ممکن ہو سکا۔ مدارس کی اہمیت و ضرورت اور مسلم معاشرے پر ان کے احسانِ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

"مدرسہ سب سے بڑی درسگاہ ہے جہاں آدمی گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں سے قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان و ادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہِ راست نبوتِ محمدی ﷺ سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور زندہ جاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ در حقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالاتر ہے وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوتِ محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔"(۵).

دینی تعلیم کی اہمیت وافادیت لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ انسان کو ایک اعلیٰ وارفع مقصد عطا کرتی ہے اور یہ مقصد عبادت ورضوانِ الٰہی ہے۔ اس کی اجمالی تفصیل یوں ہے کہ قرآن مجید میں اللہ (ﷻ) کا ارشادِ گرامی ہے:

"وَما خَلَقتُ الجِنَّ وَالإِنسَ إِلّا لِيَعبُدونِ"(٦).

کہ ہم نے جن وانس کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تو بذاتِ خود عبادات ہیں لیکن بہت سے کام ایسے بھی ہیں۔ جو بظاہر دنیاوی امور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر ان کو اللہ تعالیٰ کی منشاء ورضا کے مطابق انجام دیا جائے تو وہ بھی عبادت ہی میں شمار ہوں گے۔ مثلاً رشتہ داروں سے حسن سلوک، والدین اور اساتذہ کی خدمت اور ان کا ادب واحترام، اولاد کی اعلیٰ تربیت، باہمی ہمدردی وغیرہ کے جذبات کے تحت زندگی بسر کرنا، تجارت، ملازمت اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں حدود اللہ کا پاس رکھنا اور ان سے تجاوز کرنا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہر شعبۂ حیات میں متعلقہ اسلامی اصول وضوابط سے کما حقہ، واقفیت حاصل کرے۔ جو دینی تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"طلب العلم فريضة على كل مسلم وواضع العلم عند غير اهله كمقلد الخنازير الجوهر واللؤلؤ والذهب"(٧).

علم دین حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور نااہلوں وناقدروں کو علم سکھانے والا سور کے گلے میں جواہر، موتی اور سونے کا ہار پہنانے والے کی طرح ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی دینی مدارس کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"اس وقت مدارسِ علوم دینیہ کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں، دنیا میں اگر اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں"۔(٨).

مولانا ابوالحسن ندوی دینی مدارس کے قیام کو شرعی نظام سے تطبیق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مدارس کی اہمیت اس قدر ہے کہ اگر کسی نظام کے پست پشت دینی مدارس نہ ہوں تو وہ نظام شکستہ وریختہ ہو جاتا ہے اور وہ قوم دلدل میں دھنس جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خلافتِ راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے تاکہ اُمت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں، اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں، اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔"(۹)

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"یہی کہنی مدارس تھے (علماء اور طلباء کے نسبت مولانا کی خصوصی اصطلاح) جنہوں نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہے، اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔"(۱۰)

مدرسائی نظام عہد بہ عہد:

یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ دینی مدارس سنگ وخشت کا نام نہیں بلکہ ہر وہ مقام مدرسہ ہے جہاں علماء اور صلحاء نے بندگانِ خدا کے قلوب کو علم وعرفان سے منور کیا خواہ وہ مسجد ہو یا خانقاہ کا حجرہ، ان کا مسکن ہو یا مکتب جہاں وہ تعلیم وتربیت کے لئے بیٹھ گئے وہی دینی مدرسہ بن گیا۔ ابن بطوطہ متوفی ۷۷۹ھ نے ہمیں بتایا کہ آٹھویں صدی ہجری میں مختلف اسلامی ممالک میں جگہ جگہ خانقاہی نظام برپا تھا۔ خانقاہ کو کبھی زاویہ کہتے اور کبھی رباط۔

باقاعدہ مدارس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ہوئی سب سے پہلے مدرسہ کا نام المدرسہ الصادریۃ تھا جس کی بنیاد شام میں ۳۵۰ ہجری میں پڑی۔ پانچویں صدی ہجری کے نصف میں مدرسہ صادرہ کے نہج پر کئی دوسرے مدارس بھی قائم ہوئے ان میں قابل ذکر مدرسہ بیہقیہ اور مدرسہ سعدیہ ہیں جن کی بنیاد نیشاپور میں پڑی تھی۔ اس کے بعد بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا۔ یہ وہ مشہور مدرسہ تھا جو نمونے کے طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے بعد عالم اسلام کے مرکزی شہروں میں مدارس قائم کر کے یہی تعلیمی نظام رائج کیا گیا۔ مدرسہ نظامیہ سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان (۴۵۹ ہجری) کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی کی طرف منسوب ہے کیونکہ اس نظام کا موجد وہی تھا۔(۱۱)

یہ دینی مدارس مسلمانوں کی علمی عظمتوں کے چمکتے ہوئے نشانات تھے اور ان تمام علوم وفنون کا مرکز رہے جو علمائے سلف سے انہیں بطور میراث پہنچے تھے۔ ان کی تعلیم کے سامنے جدید تعلیم ہیچ نظر آتی ہے۔ ان علوم کے ماہرین علماء سلف آسمان علم کے وہ

چمکتے ہوئے آفتاب و مہتاب تھے جن کی عظمتوں کا اعتراف اغیار نے بھی کیا۔ غزالی، رازی، طبری، مسعودی، مقدسی، یاقوت حموی، خوارزمی کرخی، زکریارازی، زکریا قزوینی، ابن الہیثم، زہراوی ایسے نامور علماء ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ اہل یورپ کے دل و دماغ پر ابھی تک قائم ہے۔ اہل مغرب نے علمائے اسلام کے گراں قدر علمی شاہکار لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں میں منتقل کئے۔ یورپ کی موجودہ سائنسی ترقی مسلمان فضلاء کی مرہون منت ہے۔ یورپ کے جس نشاۃ ثانیہ کے آغاز پر جدید تعلیم کے پرستاروں کو فخر ہے درحقیقت وہ علمائے اسلام خصوصاً اسپین اور سسلی کے عربوں کے علمی کارناموں کی بدولت ہے۔ ان مادہ پرستوں نے اپنے مخصوص مقاصد کی بناپر صرف طبعی علوم پر زور دیا اور دیگر علوم وفنون جو انہوں نے مسلمانوں سے حاصل کئے تھے ان پر مغربی علوم کا لیبل چسپاں کر کے ہم تک پہنچانے کی کوشش کی۔

برصغیر میں علمائے دین اور مشائخ عظام نے تعلیمی مراکز قائم کئے۔ ان کی تفصیل اس مختصر سی گفتگو میں نہیں کی جاسکتی۔ تاہم موضوع کی وضاحت کے لئے ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔ محمود غزنوی کے عہد میں غزنی علم و فضل کا مرکز تھا۔ اس نے یہاں ایک دارالعلوم بھی قائم کیا جس کا مہتمم ممتاز عالم اور شاعر عنصری تھا۔ (۱۲) محمود کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے لاہور کو اپنی سلطنت کے ان علاقوں کا دارالحکومت بنایا جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع تھے اور اس کے بعد یہ شہر ہر زمانے میں اسلامی علوم کا اہم مرکز بنارہا۔ غزنی کا تمام علم اسی راستے سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ شیخ محمد اسماعیل پنجاب میں آنے والے سب سے پہلے محدث اور مفسر تھے۔ انہوں نے مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور میں سکونت اختیار کی۔ (۱۳) اسلامی ممالک میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس اور مکاتب کے قیام کا عام رواج تھا۔ محمود غزنوی اور اس کے امراء کے توسط سے یہ طریقہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ محمود غزنوی نے غزنی میں جو دارالعلوم کھولا وہ ایک مسجد ہی کے پہلو میں تھا جسے مسجد عروس فلک کہتے تھے۔ برصغیر کو غزنی، دمشق اور بغداد سے صرف مسجد میں مدرسے قائم کرنے کی روایت ہی ورثے میں نہیں ملی بلکہ یہ مدرسے ایک پورا نظام تعلیم اپنے ساتھ لائے جو ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے تین درجوں پر مشتمل تھا۔ طریق تعلیم اور نصابِ تعلیم بھی ان کے ساتھ آیا جس میں مقامی ضروریات کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی کرلی گئی۔ (۱۴) معلوم ہوتا ہے کہ دینی اور عصری علوم کے باہمی تفاوت کی داستان بہت قدیمی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ روزِ اول سے ہی دینی علوم کی چھاپ مضبوط نظر آتی ہے۔ جبکہ عصری علوم نے دینی علوم کی کھوکھ سے جنم لیا ہے۔ یہ بات وثوق کے درجہ کو پہنچتی ہے کہ دینی علوم کے اثرات عصری علوم پر بہت زیادہ حاوی نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سطور بالا میں نشاندہی کی گئی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے فرزند شاہ عبد العزیز و شاہ عبد القادر تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ بدایوں کی جامع مسجد ۶۲۰ھ میں شمس الدین التمش کے عہد امارت میں بنی۔ اس کے عقب میں مدرسہ معزی تھا، اگرچہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تاہم قرینہ و قیاس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں غالباً شمس الدین التمش ہی کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ لکھنؤ میں فرنگی محل تعلیم اسلامی کا عظیم مرکز قرار پایا جس کی بنیاد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین نے رکھی تھی۔ خیر آباد میں آزادی ہند کے علمبردار حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی اور ان کے تعلیمی مرکز کا نام تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ ٹونک میں مولانا لطف اللہ صاحب ٹونکی اور ان کا مدرسہ، کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور ان کا دار العلوم علم و فضل کے چمکتے ہوئے نشانات ہیں۔ علاوہ ازیں مشائخ کرام کی خانقاہیں جیسے پنجاب میں خانقاہ مجددیہ، یوپی میں خانقاہ امدادیہ اور خانقاہ ضیفیہ (امروہہ) اسی طرح مشائخ کرام کے مقدس آستانے جیسے مہار شریف، کوٹ مٹھن شریف، تونسہ شریف، سیال شریف، گولڑہ شریف، بھیرہ شریف، علی پور شریف ان چمکتے ہوئے نقوش پر آج بھی ملک کے مختلف گوشوں میں علماء و مشائخ مدارس دینیہ و آستانہائے عالیہ کو علم و معرفت کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ (۱۵) باخبر حضرات اگر اسی ڈیڑھ سو سالہ دور کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور تعمق نظر سے جائزہ لیں تو انہیں برصغیر کے گوشہ گوشہ میں ایسے دینی مدارس کے چمکتے ہوئے نقوش نظر آئیں گے جنہیں صحیح معنی میں اسلاف کے دینی اور علمی مراکز کی عظمتوں کا ضامن کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مشائخ صوفیاء کی ان خانقاہوں کا تصور سامنے آئے گا جو بزرگان سلف کی روحانیت اور علم و معرفت کا گہوارہ تھیں۔ ان مدارس اور خانقاہوں میں جو تعلیم دی گئی وہ اس زہر کا تریاق تھی جو مغربی تعلیم کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو پلایا گیا۔

مروجہ تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ:

جمیع علوم کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے خواہ وہ علوم الٰہیات سے متعلق ہوں یا طبعیات سے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک تمام علوم بلا امتیاز اسلامی علوم ہیں۔ البتہ مغربی مدارس اور دینی مدارس کی تعلیم میں فرق ہے۔ مغربی تعلیم اسی مخصوص انداز فکر کا نام ہے جو اہل یورپ کے مخصوص ملحدانہ مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم جو دینی مدارس سے حاصل ہوتی ہے وہ اسلامی فکر کے سانچے میں علوم کے ڈھل جانے کا نام ہے۔ انداز فکر کے بدل جانے سے فکر بدل جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کو دو شخص اپنا مطمح فکر بنالیں اور ان میں سے مثلاً ایک ماہر نفسیات ہو اور دوسرا ماہر امراض تو ہر ایک اپنے انداز فکر پر اس کے بارے میں غور و فکر کرے گا اور ہر ایک کا نظریہ اسی

کے انداز فکر کے موافق ہو گا اور دونوں کے اخذ کردہ نتائج الگ الگ ہوں گے۔ اسلامی مدارس اور مغربیہ مدارس میں خواہ نصاب تعلیم ایک ہی ہو مگر دونوں کے انداز فکر کے اختلاف کے باعث نتائج و اثرات یقیناً مختلف ہوں گے۔

تعلیم کی موجودہ ثنویت یا دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے۔ پہلے ہمارا انتظام تعلیم وحدانی اور سالمیت پر مبنی تھا۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم اور ثقافت ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس کرتا تھا وہاں سول سروس کے عہدہ دار اور ارکانِ سلطنت بھی مہیا کرتا۔ اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محب اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے۔ یہی حال دوسرے ملکوں میں بھی تھا کہ دینی و دنیوی تعلیم کے دو الگ الگ نصاب اور نظام تعلیم نہیں تھے چنانچہ سب کو علم ہے کہ مشہور ریاضی دان و شاعر عمر خیام اور سلطنت سلجوقیہ کا وزیر نظام الملک طوسی دونوں ایک ہی حلقہ درس کے شریک اور ایک ہی تعلیم کے پیداوار تھے۔ (۱۶)

مغربیت کے پرستار آج تک تعلیم کا کوئی واضح مقصد اور اس کی غرض وغایت متعین نہ کر سکے لیکن ہمارے نزدیک علوم اور ان کی تعلیم کا ایک بنیادی مقصد اور غرض وغایت ہے، جسے امام غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے:

"الایمان عریان، و لباسه التقوی و زینته الحیاء و ثمرته العلم۔"(۱۷)۔

ایمان ننگا ہے اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کی زینت حیاء ہے اور اس کا ثمرہ علم ہے۔

انسان کا علم یا اپنی ذات سے متعلق ہو گا یا کائنات سے یا خالق کائنات سے جب اس کی نظر اپنی ذات پر پڑے گی تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ حقائق کائنات کا جامع اور حسن خالقیت کا عظیم شاہکار ہے۔ یہ دونوں باتیں اس کے لئے خدا کی معرفت کا موجب ہوں گی۔ اس علم کی روشنی میں وہ اپنے دامن انسانیت سے وابستہ ہونے والے ہر ذرہ کو اپنے خالق اور صانع کی ہستی کے لئے دلیل سمجھے گا اور اپنے آئینۂ قلب میں اس کے حسن وجمال کی تجلیات کا مشاہدہ کرے گا۔ اسی طرح جب وہ کائنات کو دیکھے گا تو افراد عالم اور اجزائے کائنات کا ہر فرد اور ہر جزا اس کی نظر میں اس کی حقیقت جامعہ کے اجمال کی تفصیل ہو گا۔ وہ جانے گا کہ انسان، کائنات اور خالق کائنات کے درمیان کیا تعلق ہے؟ یہ علم اس کے اخلاق کردار اور معاشرہ کی بنیاد قرار پائے گا۔ مختصر یہ کہ قرآنی اور اسلامی علوم کی تعلیم اس مقصد عظیم کے پیش نظر صرف دینی مدارس میں ہوئی اور تعلیم کا یہ گراں قدر حصہ صرف مدارس دینیہ اور مراکز روحانیہ کے حصے میں آیا۔ اس کے

علاوہ مدارس دینیہ کے کردار کے لئے کچھ انسانی تعلیم وتربیت، تزکیہ وتذکیر کی طرف بھی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ ویسے بھی مدارس دینیہ کی افادیت کئی پہلوؤں سے آشکار ہے۔ ان مدارس میں دی جانے والی تعلیم کا مقصد صرف علم ہی نہیں بلکہ تزکیہ بھی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ(۱۸)۔

وہ خدا جس نے تمہی میں سے ایک رسول کو چنا تاکہ وہ تمہارے لئے آیات تلاوت کرے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اس سے قبل کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

بلکہ تزکیے کا ذکر تعلیم کتاب سے پہلے بھی کیا اور بعد میں بھی، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مقصود تزکیہ ہی ہے اور تعلیم بھی اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔(۱۹) چنانچہ حضور ﷺ کے طریق تعلیم سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے محض تعلیم ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ تزکیہ بھی کیا اور صحابہ کا طریقہ بھی یہی تھا کہ جتنا قرآن سیکھتے تھے، ساتھ اس پر عمل کی مشق بھی کرتے جاتے تھے۔ امام مالکنے موطا میں ذکر کیا ہے کہ "أن عبدالله بن عمر مكث على سورة البقرة ثماني سنين يتعلمها" حضرت عبد اللہ بن عمر نے سورہ بقرہ آٹھ سال میں ختم کی۔(۲۰) ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ کو ۸ سال محض ڈھائی پارے پڑھنے میں نہیں لگے بلکہ اس پر تدبر اور عمل میں اتنی مدت صرف ہوئی۔ بعد میں مسلم معاشرے میں جب تزکیہ وتربیت کے ایک خصوصی ادارے "تصوف" نے راہ پائی تو یہ طریقہ وجود میں آیا کہ طالب علم پہلے تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے بعد تزکیہ نفس کے لیے کسی دوسرے مربی کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ اب اُمت میں عمومی انحطاط کے نتیجے میں تصوف کے نام پر نہ وہ صوفی رہے اور نہ وہ خانقاہیں اور بالعموم جو کچھ باقی بچا ہے وہ بعض رسوم کا ایک بے روح ڈھانچہ ہے یا محض شکم پروری کے طریقے۔ لہٰذا تزکیہ وتربیت کو محض اس اتفاق پر نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اگر حسن اتفاق سے استاد ایسا ہو جو خود مزکی ومربی ہو تو بات بن گئی ورنہ سراسر محرومی مقدر ٹھہری بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تزکیے وتربیت کو باقاعدہ ایک مضمون اور فن کی طرح نصاب تعلیم کا ایک حصہ بنایا جائے اور دوسرے مواد کی طرح اس کا بھی باقاعدہ امتحان اور اس میں فیل ہونے والے کو سارے مضامین میں فیل تصور کیا جائے۔ محض یہ دکھانے کے لیے کہ ایسا نظام وضع کرنا ممکن ہے، ہم یہاں پر دو اقتباسات پیش کرتے ہیں:

تعلیمی ادارے میں تربیتی نظام کا قیام:

1۔ مدرسے میں ہر استاد کو خود کو مربی سمجھنا چاہیے (خصوصاً صدر مدرّس اور مہتمم کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو طلبہ کے سامنے ایک ماڈل کے طور پر پیش کرے بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے بڑھ کر طلبہ کی تربیت کرے۔

2۔ اگر کسی وجہ سے سربراہ ادارہ خود اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں نہ سمجھے تو اسے چاہیے کہ کسی موزوں استاد کو چیف مربی کے طور پر مقرر کر دے جو سارے سکول کے طلبہ کی تربیت کے لیے ایک مکمل اور مربوط لائحہ عمل مرتب کرے۔

3۔۔ چیف مربی کو چاہیے کہ اساتذہ میں سے ہر کلاس کا ایک مربی مقرر کرے، بہتر ہو اگر ایسا استاد کلاس انچارج بھی ہو۔

4۔ مربی استاد کو تدریس کے علاوہ کم از کم ہفتے میں ایک پیریڈ طلبہ کی تربیت کیلئے دیا جانا چاہیے۔

5۔ کلاس کے مربی استاد کو چاہیے کہ کلاس کے طلبہ میں سے کسی موزوں طالب علم کو 'مربی' یعنی طلبہ کے اخلاق و کردار کا نگران مقرر کرے۔

6۔ اگر تعلیمی ادارہ رہائشی ہو تو ہوسٹل کا ایک مربی ہونا چاہیے اور طلبہ میں سے ایک اس کا نائب ہو اور اگر ہوسٹل کے کئی بلاک ہوں تو ضروری ہے کہ ہوسٹل کے ہر بلاک میں ایک اُستاد مربی ہو جو طلبہ کے اخلاق و کردار کا ذمہ دار ہو۔ یہ اُستاد ہر ہوسٹل بلاک میں طلبہ میں سے کسی ایک موزوں طالب علم کو مربی یعنی طلبہ کے اخلاق و کردار کا ذمہ دار بنادے۔

7۔ چیف مربی اور مربی اساتذہ پر مشتمل ہر سکول میں ایک تربیتی کونسل ہونی چاہیے جو اپنے اجلاس باقاعدگی سے ہر ماہ منعقد کرے اور تربیت کے مسائل پر غور و فکر کرے۔

8۔ ہر سکول میں طلبہ کی تربیت کی جانچ اور تربیت کے نگران اساتذہ کی چیکنگ کا موثر انتظام ہونا چاہیے۔

تربیت کی جانچ (امتحان) کا نظام:

جس طرح تعلیم میں طالب علم کی لیاقت جانچنے کے لیے امتحانوں کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سا طالب علم کتنا سیکھ رہا ہے اور ان امتحانوں ہی کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کو خصوصی تیاری کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح تربیت کے کام کی جانچ کا بھی ایک نظام ہونا چاہیے... ہم اس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کرتے ہیں:

(1)تربیتی گراف کا طریقہ اپنایئے جس کی تفصیل یہ ہے:

الف: ہر مربی کلاس ٹیچر اپنی کلاس کا ایک تربیتی گراف بنائے جس میں طلبہ کے نام موجود ہوں۔

ب: اچھی کارکردگی کی صورت میں اضافی نمبر دیئے جائیں اور کمزوری دکھانے کی صورت میں نمبر منہا کر دیئے جائیں مثلاً اگر بنیادی نمبر ۱۰۰ ہوں تو جو طالب علم باقاعدگی سے نماز پڑھے، اسے ۲ نمبر دیئے جائیں اس طرح اس کے نمبر ۱۰۲ ہو جائیں گے اور جو طالب علم نماز نہ پڑھے تو اس کے ۲ نمبر منہا کر دیئے جائیں یعنی اس کے ۹۸ نمبر ہو جائیں۔ اس طرح مختلف کمزوریوں مثلاً جھوٹ بولنا، گالی دینا، جھگڑا کرنا، تاخیر سے سکول آنا اور وقت کی پابندی نہ کرنا وغیرہ ان میں سے ہر ایک کے دو نمبر ہوں اور ان کے ارتکاب پر اتنے نمبر کاٹ لئے جائیں اور اس کے برعکس اخلاقِ حسنہ کے بھی نمبر ہوں جو اس کے گراف میں جمع کر دیئے جائیں۔ اس طرح ہر طالب علم کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کی اخلاقی حالت کیسی ہے؟

ج: ایسا تربیتی گراف نمایاں طور پر ہر کلاس میں آویزاں ہو تاکہ طلبہ اپنے نمبروں کی کمی بیشی سے آگاہ رہیں، جن کے نمبر کم ہو جائیں وہ اپنی اخلاقی کمزوری دور کر کے اپنے کم شدہ نمبر بڑھانے کی کوشش کریں اور جن کے نمبر زیادہ ہوں، وہ انہیں مزید بڑھانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس گراف میں جس طالب علم کے نمبر ایک مقررہ حد سے کم ہو جائیں، اسے تربیت کے پرچے میں فیل کر دانا جائے او راگلی کلاس میں نہ بھیجا جائے۔ جس لڑکے کے نمبر سب سے بڑھ جائیں، اُسے حوصلہ افزائی کا انعام دیا جائے یا سکول کا مثالی لڑکا قرار دیا جائے۔

د. اس طرح کا گراف ہر طالب علم کی پرسنل فائل میں بھی موجود ہو اور کلاس روم میں درج ہونے والی معلومات وہاں بھی ریکارڈ کی جائیں۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے مثلاً بچے کے والدین کو دکھانے کے لیے یا فائل دیکھتے ہوئے بچے کی اخلاقی حالت کا اعادہ کرنے کے لیے۔

(2)تربیتی گراف کو سامنے رکھتے ہوئے طلبہ کا سالانہ امتحان بھی لیا جائے اور اس کے باقاعدہ نمبر ہوں جو طالب علم کے فیل یا پاس ہونے پر اثر انداز ہوں۔ ایک طالب علم اگر تربیت میں فیل ہو تو اسے سارے مضامین میں فیل تصور کیا جائے اور اگلی کلاس میں ترقی نہ دی جائے۔

(3) مربی اساتذہ کا احتساب اور چیکنگ بھی ہونی چاہیے تاکہ اگر ان کو مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہو تو وہ بر وقت مہیا کر دی جائے۔ اس غرض کے لیے چیف مربی یا مہتمم کو چاہیے کہ وہ تربیت کے انچارج اساتذہ سے ان کی کارکردگی بسلسلہ تربیت طلبہ کی ماہانہ رپورٹ طلب کرے اور مسائل ومشکلات میں اُن کو ضروری مشورے دے۔ اگر کافی تعداد میں طلبہ تربیت میں کمزور ہیں تو اُستاد کی پرسشش ہونی چاہیے اور اسے تنبیہ کی جانی چاہیے بلکہ اس کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ میں بھی اس کا اندراج ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ دینی مدارس کے مہتممین اور منتظمین کو اس امر کی فکر کرنی چاہیے کہ ان کی ذمہ داری محض دینی تعلیم دینا نہیں بلکہ اخلاق وآداب سمیت مکمل دینی شخصیت کی آبیاری کرنا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو عند اللہ مسؤل ہوں گے۔

تحقیق:

آج کل کی جدید تعلیم میں ایم اے (عالیہ) ہی سے تحقیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ساری تعلیم (ایم فل، پی ایچ ڈی وغیرہ) تحقیق پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ دینی مدارس میں تحقیق کو عموماً اہمیت نہیں دی جاتی۔ طالب علم دورۂ حدیث کر کے فارغ ہو جاتا ہے مگر اسے تحقیقی اصولوں کا پتہ ہوتا ہے اور نہ اُسے تحقیق کی کوئی عملی مشق ہی کروائی جاتی ہے۔ بعض بڑے دینی مدارس میں تخصص کا ذکر سننے میں آتا ہے لیکن وہ بھی عموماً روایتی انداز میں، لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تحقیق کو باقاعدہ داخل نصاب کیا جائے۔ ہر اُستاد چھوٹے چھوٹے مقالے لکھوا کر طلبہ کو تحقیق کی مشق کروائے۔ آخری سال کے شروع میں ہر طالب علم اپنے موضوع تحقیق کی تسجیل (رجسٹریشن) کروائے اور جب تک وہ تحقیقی مقالہ اُستاذ کی تسلی کے مطابق مکمل نہ کرے، اُسے سند جاری نہ کی جائے۔ اس کے بعد تخصص کو رواج دیا جائے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کی طرح ریسرچ ڈگریوں کو رواج دیا جائے۔ ظاہر ہے اس وقت جو نصاب مروّج ہے، اس میں رہتے ہوئے یہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی، البتہ ہماری تجاویز کے مطابق اگر نصاب کے سارے ڈھانچے پر از سرِ نو غور کیا جائے تو تحقیق کو جزو نصاب بنایا جا سکتا ہے۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تحقیق کو جز بنانا غیروں کی تقلید ہے بلکہ ہمارے اَسلاف نے تحقیق کا جو معیار قائم کیا ہے اور جس طرح عمریں تحقیق و تالیف میں صرف کی ہیں، وہ ہمارے لیے ایک قابل فخر نمونہ ہے۔ لہٰذا تحقیق کو جزو نصاب بنانا، طلبہ میں علمی و تحقیقی ذوق پروان چڑھانا اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا اپنے اَسلاف کی علمی روایت کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ اس میں کوتاہی کرنا دوں ہمتی ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں 'نکو' بننے کے مترادف ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ تحقیق محض اپنے مسلک کو سچا ثابت کرنے کے لیے دلائل جمع کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ تحقیق سے مراد تلاشِ حق ہونا چاہیے اور اس کے لیے پہلا زینہ معروضیت اور غیر جانبداری کا ہے کہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ علم کا دامن تھاما جائے۔ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ شروع میں ایسے تحقیقی مقالات لکھوائے جائیں جن میں مقارنہ (تقابلی مطالعہ) کا اہتمام ہو، تاکہ اختلافی معاملات میں دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور وزن دینے کا رجحان پیدا ہو۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں اس وقت جتنی تحقیق ہو رہی ہے، مسلم دنیا کا اس میں حصہ دس فیصد سے بھی کم ہے۔ مغرب صرف تحقیق کے بل پر تسخیر کائنات (سائنس اور ٹیکنالوجی) میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ ہم بحیثیت اُمت جب تحقیق میں آگے تھے تو اس دنیا پر ہمارا سکہ چلتا تھا۔ آج ہم تحقیق میں پیچھے رہ گئے ہیں تو ہر لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خود اسلامی علوم میں تحقیق کے سلسلے میں مغرب میں جو کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے، ہمارے علما اگر انگریزی پڑھیں تو انہیں احساس ہو کہ ہمارے دامن میں شرمندگی کے سوا کچھ نہیں۔

روزگار:

اس وقت ہمارے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ روزگار ہے اور وہ ہے اپنے مسلک کے مدارس و مساجد میں ملازمت۔ ظاہر ہے یہ مواقع محدود ہوتے ہیں۔ اس لیے سب لوگ اس میں نہیں کھپ سکتے ہیں۔ یہ چیز نہ صرف بے روزگاری کو جنم دے رہی ہے بلکہ اس سے بعض دیگر مفاسد بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً دوسری مسالک کی مساجد پر قبضہ جو بعض اوقات نقض امن پر منتج ہوتا ہے یا بغیر ضرورت کے محض روزگار کے لیے نئی مساجد اور مدارس کا قیام (حقیقت یہ ہے کہ اس امر پر ایک تحقیقی سروے کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری آبادی کو اس وقت کتنے مدارس و مساجد کی ضرورت ہے۔ ان مدارس سے کتنے طلبہ سالانہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور ان کا ذریعہ روزگار کیا ہے؟... وغیرہ)

روزگار کے مواقع پیدا کرنا یا ان کی پلاننگ کرنا بنیادی طور پر ہماری حکومت کا کام ہے لیکن اگر حکومت کی مدد کے بغیر دینی مدارس کا اتنا بڑا نیٹ ورک چل رہا ہے تو انہیں اپنے طلبہ کے روزگار کے مسئلے پر حکومتی مدد کے علی الرغم بھی غور کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے منتظمین اپنے طلبہ کو جدید تعلیم اور پیشہ وارانہ تعلیم نہ دینے کے حق میں اس لیے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ طلبہ مجبور ہو کر مساجد و مدارس کو آباد رکھیں گے ورنہ وہ کہیں اور ملازمت کر لیں گے جہاں

انہیں زیادہ تنخواہ ملے گی اور مساجد و مدارس ویران ہو جائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ خدشہ بے جا ہے کیونکہ اس وقت جتنے طلبہ ان مدارس سے فارغ ہو رہے ہیں، ان کے لیے ملازمتیں موجود نہیں ہیں۔ ہماری رائے میں دینی مدارس کے طلبہ کے روزگار کی پلاننگ کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور ہونا چاہیے:

1۔ حکومت پاکستان ان مدارس کی ڈگریوں کو درجہ بدرجہ تسلیم کرکے یعنی ثانویہ عامہ میٹرک کے برابر، ثانویہ خاصہ ایف اے کے، عالیہ بی اے کے اور عالمیہ ایم اے کے برابر قرار دی جائے۔ تاکہ ان طلبہ کے لیے جدید تعلیم اور پرائیویٹ و پبلک سیکٹر میں روزگار کے دروازے کھل سکیں۔ اسی طرح عالمیہکے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ جنرل ضیاءُالحق کے زمانے میں اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی لیکن بعد میں معاملہ سست پڑ گیا۔ اب حال ہی میں جاری ہونے والی تعلیمی پالیسی میں میٹرک اور ایف اے میں درسِ نظامی گروپ متعارف کروایا گیا ہے اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے بھی درسِ نظامی کے مضامین میں ڈگریاں دینے کا آغاز کر دیا ہے لہٰذا امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل قریب میں دینی مدارس کے نظام تعلیم اور حکومتی نظام تعلیم کے درمیان حائل فرق بتدریج کم ہوتا جائے گا۔

2۔ ہماری تجویز کے مطابق اگر دینی مدارس عربی کے ساتھ اپنے طلبہ میں انگریزی اور اردو میں بھی مہارت پیدا کر دیں اور انہیں جدید علوم کا تعارفی مطالعہ بھی کروا دیں تو ہمارے خیال میں وہ معاشرے میں بہت سے میدانوں میں اپنی راہ خود بنا لیں گے۔

3۔ جس نصاب کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ سولہ سال میں اسلامی علوم میں ایم اے (عالمیہ) کا ہے لیکن اس میں بی اے (عالیہ) تک اُردو، عربی اور انگریزی زبانیں بھی پڑھائی جائیں گی گویا پاکستانی یونیورسٹیوں میں اس وقت مروج قاعدے کے مطابق بھی وہ ان تین مضامین میں ایم اے کرنے کے حق دار ہیں، ہماری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو ان تین زبانوں میں بی اے (عالیہ) کرنے کے بعد تین سالوں میں اس طرح ایم اے کروا دیا جائے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک زبان ان کا اصلی تخصص ہو اور علوم اسلامی ضمنی تخصص۔ اس طرح وہ سولہ کی بجائے سترہ سالوں میں ان زبانوں میں سے کسی ایک میں ایم اے بھی کر لیں گے اور ساتھ ہی ثقہ دینی عالم بھی ہوں گے اور اُن کے لیے روزگار کے زیادہ مواقع بھی پیدا ہو جائیں گے۔

4۔ بعض پیشہ ورانہ اُمور میں تربیت دینی تعلیم کے ساتھ بھی اس طرح دی جا سکتی ہے کہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے تک اس شعبے میں مہارت بھی حاصل کر لیں خصوصاً اس سہولت کی وجہ سے کہ طلبہ کی رہائش بھی انہی مدارس میں ہوتی ہے، مثلاً مختلف کمپیوٹر

کورسز اور کمپوزنگ وغیر ہبجلی کا کام، فریج، ٹی وی وغیرہ کی مرمت، گاڑیوں کی مرمت، ٹائپ، شارٹ ہینڈ، دفتری اُمور، ابتدائی حسابات ، تدریسی مہارت (سی ٹی، بی ایڈ کی طرز پر) چھوٹے موٹے بزنس وغیرہ۔

بڑے شہروں میں دینی مدارس انڈسٹری کے ساتھ رابطہ کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں یا شام کی شفٹ میں طلبہ کو اضافی کام دلوا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے خود دینی مدارس یہ فیصلہ کریں کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے مسلک کے مدارس و مساجد کے باہر رزق کے دروازے کھولنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے خیال میں اس طرح کے مواقع پیدا ہونے سے دینی کاز کو ان شاء اللہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ جیسا کہ ماضی میں دیوبند میں طب، جلد سازی اور خطاطی وغیرہ کے شعبے قائم کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

نصابِ تعلیم میں تنوع اور تغیر پذیری... چند تاریخی نظائر

عہدِ رسالت ﷺ و صحابہ رضی اللہ عنہ میں دینی نصابِ تعلیم کا ایک ہی باقاعدہ مضمون تھا اور وہ تھا قرآن حکیم یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی والدین کو یہ ہدایت سامنے آتی ہے کہ:

"اپنے بچوں کو تیراکی، شہسواری، مشہور ضرب الامثال اور اچھے اشعار سکھاؤ۔"(۴۱)

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ (م ۱۰۱ھ) نے حدیث اور مغازی کے درس کا حکم دیا۔(۴۲) دوسری صدی میں موطاؑ کی تالیف سے تدوین حدیث کا کام شروع ہوا تو درسِ حدیث نے محکم صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح جب فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو مساجد و مدارس میں اس کی تحصیل بھی شروع ہو گئی۔ چوتھی صدی ہجری میں تصوف بطور ایک ادارہ کے اُبھرا اور اس پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو وہ کتب بھی نصاب کا حصہ بن گئیں۔ قرآن و حدیث، ان سے متفرع علوم اور فقہ تو خالص دینی علوم اور عربی زبان و ادب اور تاریخ و جغرافیہ، مسلمانوں کی اپنی داخلی فکری حرکت کا نتیجہ تھے لیکن جلد ہی مسلمانوں نے یونانی اثرات کے تحت سماجی علوم میں منطق، فلسفہ ، علم النفس، علم الکلام اور زبانوں میں یونانی، عبرانی، ترکی، فارسی، وغیرہ پڑھنی پڑھانی شروع کر دیں۔ اسی طرح سائنسی علوم میں طب (میڈیکل)، ہندسہ (انجینئرنگ)، ریاضی، ہیئت و فلکیات (اسٹرانومی)، اور کیمیا (کیمسٹری) وغیرہ مسلمان معاشرے میں علم پڑھنے پڑھائے جانے لگے۔ یہ علوم دینی مدارس اور مساجد میں پڑھائے جاتے تھے اور دینی و دنیوی علوم یا خالص دینی اور عصری علوم میں کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جاتا تھا۔(۴۳)

دور کیوں جایئے۔۔۔خود مسلم ہندوستان کی نصابی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ خالص دینی علوم کے ساتھ وہاں معاون علوم کے طور پر دیگر سماجی وسائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اوران کی ترجیحات میں بھی ردّوبدل ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً چودہویں سے سولہویں عیسوی کے وسط تک دینی مدارس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول، کلام، تصوف کے ساتھ ساتھ صرف نحو، معانی، علم ہیئت وجغرافیہ اور منطق بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس زمانے میں زور فقہ، اُصولِ فقہ پر تھااور تدریسِ حدیث کی اہمیت قدرے کم تھی۔(۲۴)

سولہویں صدی کے وسط میں اور سکندر لودھی کے زمانے میں مولانا عبد اللہ اور عزیز اللہ نے فقہ اوراُصول کی کمیت کم کر کے منطق وفلسفے کی کتب میں اضافہ کر دیا۔ اسی طرح علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے علم بلاغت اور کلام میں نئی کتب مروّج کرائیں، لیکن شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد کوشش کے باوجود فنِ حدیث کو رائج نہ کرا سکی۔

اس کے بعد دورِ اکبری میں شاہ فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے تو انہوں نے نصاب میں مزید تبدیلیاں کیں۔ ان کے مرتب کردہ نصاب کی جو تفصیل دی گئی ہے، اس میں تفسیر، حدیث، فقہ واُصولِ فقہ، تصوف اور کلام کے علاوہ نحو، منطق، بلاغت، فلسفہ، ہیئت، حساب اور طب بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے اس فہرست میں دینی علوم کے علاوہ تقریباً اتنے ہی مضامین معاون اور عصری علوم کے ہیں جن میں سماجی اور سائنسی علوم دونوں شامل ہیں۔ اسی زمانے میں فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیااور سنسکرت کی تدریس بھی شروع ہو گئی اوربقول شبلی، موسیقی بھی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھی۔(۲۵) شاہ ولی اللہ نے علم حدیث کو مروّج کرنے کی کوشش کی اور معقولات پر مزید زور دیا۔(۲۶)

ملا نظام الدین(۱۷۴۷ء) نے جو نصاب بنایا، جو آج درسِ نظامی کے نام سے مشہور ہے، اس میں تفسیر، حدیث، فقہ واُصولِ فقہ، کلام کے علاوہ صرف ونحو، بلاغت، منطق، فلسفہ اور ریاضی شامل تھے۔ اس نصاب میں قرآن وحدیث کا حصہ بہت تھوڑا تھا۔ سیرت، تصوف، معاشرتی علوم وغیرہ موجود نہ تھے اور معقولات پر زور تھا۔ تاہم اس میں بھی تبدیلیوں کا عمل جاری رہا۔ ملا نظام الدین کی وفات کے بعد اِس میں مناظرہ، اُصولِ حدیث، ادب اور فرائض کے مضامین کا اضافہ کیا گیا۔

جب ۱۸۷۶ء میں دیوبند قائم ہوا تو وہاں بھی درسِ نظامی ہی رائج ہوا لیکن مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید گنگوہی نے دیوبند میں رائج درسِ نظامی کو مختصر کرنے کا فیصلہ کیا اور فارسی کے علاوہ منطق و فلسفہ کی پرانی کتابیں نصاب سے خارج کر دیں۔ اور مدت تدریس دس کی بجائے چھ سال کر دی، تاکہ طلبہ درسگاہ سے جلد فارغ ہو کر جدید تعلیم بھی حاصل کریں، مولانا کے الفاظ یہ تھے:

"اس کے بعد (مدرسہ میں دینی تعلیم کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارسِ سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موثر ہوگی۔"(۲۷)۔

ایک اور موقع پر مولانا گنگوہی نے کہا تھا:

"سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدید تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی نہ ہوئی ہوگی۔"(۲۸)۔

لیکن روایتی علما کے احتجاج پر انہیں پرانا نظام بحال کرنا پڑا۔(۲۹) علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے درسِ نظامی کی کافی تعریف کی ہے۔ شبلی نے تو درسِ نظامی کو ہندوستان کا فخر کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"درسِ نظامی ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے۔ کسی کتاب کا درسِ نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ نصابِ تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ درسِ نظامیہ اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامہ فخر ہے لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسہ اعظم نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا اس کی عالمگیر شہرت نے اس قدر وسعت درازی کی کہ اس سلسلہ کو بھی اس کے فہرست اعمال میں داخل کرنا چاہا، چنانچہ ہمارے زمانہ کے اکثر ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا، یہاں تک کہ ایک اردو تصنیف میں صراحتاً یہ دعویٰ کیا گیا۔"(۳۰)۔

مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں:

.........اگر کوئی پڑھنے والی جماعت ہے تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ کے کسی طالب نے کالج نہیں چھوڑا، جب تک دو دو گھنٹے تک مجھ سے رد و کد کر کے اطمینان نہیں کرا لیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے بعد وہ روپیہ کما سکیں گے۔ حتیٰ کہ بعض نے مجھ سے اس کی ذمہ داری بھی طلب کی۔ لیکن میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ ان طلبہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو بلکہ جس وقت ان کو احکام شرع بتلا دیئے گئے فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا اور سب کچھ چھوڑ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔(۳۱)۔

ان دو حضرات کے علاوہ خود حلقہ دیوبند کے اپنے لوگوں میں سے مولانا مناظر احسن گیلانی کہ جس نے لکھا ہے:... نظامی درس کے معقولات کی ہوا ابھی اکھڑ چکی ہے اور مغل دربار کے دفتریوں کی اولاد فارسی ادب کی اس اہمیت کو بھلا چکی ہے جو صرف موروثی روایات کی پیداوار تھی۔ اہل بصیرت پر عربی زبان کی دونوں قسموں کی نوعیت واضح ہو چکی ہے۔ یعنی خالص اسلامی علوم (قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ) کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے جس حصہ سے واقفیت کی ضرورت ہے وہ اس حصہ سے بالکل مختلف ہے جس کی ضرورت صرف ان لوگوں کو ہے جو عربی زبان کی جاہلی و اسلامی ادبی ذخیروں پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسے قدرتی تغیرات ہیں جن کی وجہ سے خالص اسلامی علوم کے نصاب میں کافی گنجائش اس بات کی پیدا ہو چکی ہے کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری مدارس میں داخل ہونے کے لئے بطور مقدمہ کے جن چیزوں کے سکھانے کی ضرورت ہے ان کو نصاب میں شریک کر کے قدیم وجدید علوم میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق رشتہ قائم کرنے کے لئے راہ درست کی جائے۔(۳۲) اسی طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۳۳) قاضی زین العابدین سجاد (۳۴) اور دوسرے بہت سے علما درسِ نظامی کے موجودہ نصاب پر علی الاعلان تنقید کرتے رہے ہیں۔ بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۵ء) نے تو دہلی میں باقاعدہ ایک ادارہ نظارۃ المعارف کی بنیاد رکھی تا کہ دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیمی اداروں کو یکجا کیا جا سکے۔(۳۵) خود دار العلوم نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا تھا کہ فلسفہ کی جدید کتابوں کو داخل درس کیا جائے گا لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔(۳۶) مولانا حسین احمد مدنی کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دار العلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل اس مقصد کے لیے کی جس نے نصاب میں کئی ترمیمات تجویز کیں اور قدیم علوم عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علوم جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی مگر بعض وجوہ سے اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا(۳۷) تاہم اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔(۳۸) پاکستان بننے کے بعد درس نظامی میں معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں چنانچہ دینی تعلیم کے موجودہ وفاقوں کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ معقولات پر زور کم

ہوا ہے اور قرآنِ حکیم کے مکمل ترجمے کو شاملِ نصاب کر لیا گیا ہے۔(۳۹) وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ نصاب کے بارے میں ہمارے اہلِ علم و فکر کی رائے کس طرح بدلتی ہے، ہم اس کی ایک دو مثالیں مزید دے کر اب بحث کو ختم کرتے ہیں: علمِ ہندسہ کے بارے میں ابن خلدون نے کہا ہے کہ اس سے انسانی صلاحیتوں کو جلا اور اس کے جذبہ صدق و صفا کو استحکام ملتا ہے۔(۴۰) اس کے برعکس اس علم کے بارے میں مجدد الفِ ثانی کی رائے یہ ہے کہ علم ہندسہ بیکار اور مہمل علم ہے۔(۴۱) فقہ صدیوں سے مسلم معاشرے میں اسلامی علوم کا ایک ستون ہے لیکن امام غزالی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ کہ یہ علم مصالح دنیا ہے۔(۴۲) تصوف کی کتابیں بھی صدیوں ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی رہی ہیں لیکن ہندوستان کے عظیم درویش صفت حکمران اورنگزیب نے مجدد صاحب کے خطوط پڑھنے پر پابندی لگا دی(۴۳) اور صوفی محب اللہ کی کتاب تسویہ کو جلانے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ دیوبند میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے صوفیوں کی موجودگی کے باوجود کتبِ تصوف کو دیوبند کی درسیات میں جگہ نہ مل سکی۔

طریقہ تعلیم و تدریس میں تغیر و تبدل:

صدرِ اوّل میں تعلیم مسجد میں اور زبانی ہوتی تھی۔ استاد درس دیتا تھا اور یاد کرنے والی نصوص خصوصاً احادیث کو تین دفعہ دہراتا تھا تاکہ طلبہ کو یاد ہو جائیں۔ اس غرض کے لیے ایک مُعید (دہرانے والا) بھی ہوتا تھا جو اُستاد کی مدد کرتا تھا۔ لکھنے کی سہولت جب عام ہوئی تو یہ طریق تلقین، طریق املا میں بدل گیا۔ اب طلبہ استاد کے لیکچر کے نوٹس لے لیتے تھے اور یہ نوٹس بعض اوقات کتابی صورت میں جمع کر دیئے جاتے تھے۔ (ابو علی کالی اور سید مرتضیٰ کے امالی، دراصل ان کے دروس اور لیکچر ہی ہیں) عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر جب طالب علموں کے لیے کتابوں کا حصول عام ہو گیا تو تدریس کتابی صورت اختیار کر گئی۔ اب اُستاد لیکچر کی بجائے کتاب پر اعتماد کرتا۔ طالب علم کتاب پڑھتا جاتا اور اُستاد مشکل مقامات کی شرح کرتا جاتا یا طلبہ کے سوالات کا جواب دے کر مسائل واضح کر دیتا۔ پھر ایک زمانے میں جب ان کتابوں پر حاشیے اور شرحیں لکھی جانے لگیں تو استاد بھی یہ شرحیں اور حواشی پڑھنے لگے اور اصل کتابیں پس منظر میں رہ گئیں۔ ابتدائی تعلیم مساجد یا ابتدائی مکاتب میں جنہیں کُتّاب کہا جاتا تھا، دی جاتی تھی۔ یہاں قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی ابتدائی مہارتیں سکھائی جاتی تھیں۔ اساتذہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے اور طلبہ کو مار بھی پڑتی تھی۔ ابن خلدون نے اپنے مشہورِ زمانہ مقدمہ کی ایک فصل میں قرآن کے طرقِ تدریس پر بحث کی ہے کہ عالم اسلام میں عموماً بچے کو قرآن چھوٹی عمر میں پڑھا اور رٹا دیا جاتا ہے جب کہ اسے کچھ سمجھ نہیں ہوتی لیکن مغربِ عربی خصوصاً اندلس میں یہ طریقہ رائج ہے کہ بچے کو پہلے زبان پڑھائی جاتی ہے اور جب وہ زبان کی باریکیوں کو سمجھنے لگتا تو پھر اسے قرآن پڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ کر پڑھے۔ ابن خلدون

نے قاضی ابنُ العربی کی کتاب الرحلۃ کے حوالے سے قاضی صاحب کے موٴخر الذکر طریقے کو راجح سمجھنے کے رجحان کو خود بھی پسند کیا ہے بشرطیکہ اس اَمر کا یقین ہو کہ بچہ تعلیم جاری رکھے گا۔ ورنہ والدین اس ڈر سے کہ بڑا ہو کر بچہ نہ معلوم، تعلیم جاری رکھے تو کم از کم قرآن تو پڑھا ہوا ہو کیونکہ والدین اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دینا اپنی اخلاقی و دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔(۴۴)۔

اساتذہ:

اساتذہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی جان ہوتے ہیں۔ نصاب اگر ناقص بھی ہو تو ایک اچھا استاد اس کی کمی پوری کر سکتا ہے لیکن اگر استاد نالائق ہو تو اچھا نصاب بھی اس کے لیے بیکارِ محض ہے۔ استاد کی یہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ طلبہ، شعوری اور غیر شعوری طور پر، استاد کو ماڈل سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی میں استاد کی شخصیت اس کے کردار، عادات اور رویوں کی نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح کا استاد ہو گا اسی طرح کے شاگرد ہوں گے۔ استاد کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ استاد کو اہمیت دی جائے جس کے لیے مندرجہ ذیل امور ناگزیر ہیں:

(1) دینی مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام ہونا چاہیے یعنی جو فارغ التحصیل طالب علم استاد بننا چاہے، اس کے لیے لازمی ہو کہ وہ پہلے تربیتِ اساتذہ کا کورس مکمل کرے جس کا دورانیہ کم سے کم ایک سال ہو جس میں نہ صرف تعلیم و تربیت کے اُصول اور منہاج طلبہ کو سکھائے جائیں بلکہ تدریس کی عملی مشق بھی کروائی جائے۔ اسی طرح اس ٹریننگ میں نہ صرف تدریس کے فنی پہلوؤں پر توجہ دی جائے بلکہ زیرِ تربیت اساتذہ کی نظریاتی تربیت بھی کی جائے تاکہ نہ صرف ان کے اپنے اندر ایک مثالی مسلمان بننے کا داعیہ پیدا ہو بلکہ اپنے طلبہ کو مثالی مسلمان بنانے کا جذبہ بھی ان کے اندر خوب انگیخت ہو اور اس کے منہاج اور حکمتِ عملی سے بھی وہ بخوبی واقف ہوں۔

(2) جو اساتذہ اس وقت دینی مدارس میں پڑھا رہے ہیں اور انہوں نے کسی طرح کی تربیت حاصل نہیں کی، ان کے لیے کام کے دوران تربیت اور چھٹیوں میں ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے۔

(3) اساتذہ کے کیڈر (کورس) بنائے جائیں یعنی یہ طے کر دیا جائے کہ کس اہلیت کا استاد کس درجے کے طلبا کو پڑھا سکتا ہے۔ بڑے درجوں کو پڑھانے والے اساتذہ کے لیے تجربے، تحقیق اور تصنیف و تالیف کی خصوصی شرائط ہونی چاہئیں۔ متعلقہ اہلیت کے بغیر استاد کی تعیناتی کالعدم تصور ہونی چاہیے۔ اسی طرح اساتذہ کی کم از کم تنخواہوں کے سکیل بھی مقرر ہونے چاہیے۔ اگرچہ یہ بات ہمارے

علم میں ہے کہ دینی مدارس پر بہت زیادہ مالی بوجھ ہے لیکن اس کے باوجود ان مدارس کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اساتذہ کے حالاتِ کار بہتر بنائے جائیں۔ انکے معاوضے بڑھائے جائیں اور انہیں باعزت زندگی گزارنے کے مواقع مہیا کئے جائیں تاکہ وہ دلجمعی سے عمل تدریس میں فعال کردار ادا کر سکیں۔

(4) تدریسی تربیت کے لیے صرف ان طلبہ کو منتخب کیا جائے جو تدریس کا رجحان رکھتے ہوں اور اسے بطور مشن اپنانا چاہتے ہوں۔ یہ نہ ہو کہ جسے اور کوئی ملازمت نہ ملے وہ مدرس بن جائے۔ نیز اس امر کی ضمانت کے لیے کہ صرف لائق طلبہ ہی اس طرف آئیں، انتخاب کے وقت کڑا معیار مقرر ہونا چاہیے مثلاً کم از کم درجہ جید جدا... نیز انٹرویو کے علاوہ اس غرض کے لیے خصوصی امتحان بھی لیا جاسکتا ہے۔

(5) دوسرے بڑے اداروں کی طرح دینی مدارس میں بھی اساتذہ کے لیے اجتماعی سہولتیں ہونی چاہئیں جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلے کی سہولت میں اولڈ ایج بینیفٹ (کبر سنی فنڈ) اور بنوولینٹ فنڈ (اجتماعی بہبود فنڈ) وغیرہ۔ دینی مدارس کے وفاقوں کو اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان سے اصرار کر کے بعض سہولتیں لینی چاہئیں تاکہ دینی مدارس میں تدریس اگر پرکشش نہیں تو کم از کم قابل قبول پیشہ تو بن سکے۔

طلبہ:

اس وقت عمومی کیفیت یہ ہے کہ والدین غربت کی وجہ سے اگر بچوں کی تعلیم و پرورش نہ کر سکیں یا بچہ خدانخواستہ معذور ہو جائے یا جدید تعلیم میں نہ چلے تو اسے دینی مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا ہے کہ چلئے اسی بہانے وہ مفت میں پل بھی جائے گا اور کچھ پڑھ لکھ بھی جائے گا۔ ایسے طلبہ سے کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قوم کی دینی رہنمائی کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں گے۔ دوسری طرف دیکھئے کہ سی ایس پی افسر، ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لیے چونکہ پرکشش تنخواہیں اور سنہری مستقبل کا خواب ہوتا ہے لہٰذا قوم کی کریم اور اس کے ذہین ترین افراد ان شعبوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور دینی مدارس کے حصے میں محض جھجھٹ ہی آتی ہے۔ اس صورتِ حال پر غور کرنے بلکہ اس سے نکلنے کی فکر اور پلاننگ ہونی چاہیے تاکہ ذہین بچوں کو دینی تعلیم کی طرف آنے کے لیے راغب کیا جاسکے۔ اس کے لیے ہمہ جہتی اقدامات کی ضرورت ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مثلاً دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے روزگار کے مواقع وسیع کرنا، اچھے اساتذہ کا تقرر، دینی مدارس کے تعلیمی ماحول کو بہتر بنانا اور معاشرے کے کھاتے

پیشے افراد کو ترغیب دلانا اور مطمئن کرنا کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے فارغ کریں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ بعض اوقات والدین مجبوری یا شوق وجذبات میں آکر بچوں کو دینی تعلیم کی طرف دھکیل دیتے ہیں جب کہ بچے کا اپنا رُجحان اس کی طرف نہیں ہوتا۔ ایسے بچے کا، ظاہر ہے، دینی تعلیم کے لحاظ سے کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ والدین صرف ان بچوں کو دینی تعلیم کی طرف بھیجیں جن میں وہ ضروری رجحان دیکھیں اور اپنی مجبوریوں یا شوق سے بچے کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب بچہ سن شعور کو پہنچ جائے تو یہ حق اسے دیا جانا چاہئے کہ وہ مستقبل میں دینی تعلیم حاصل کرے گا یا نہیں؟ اس طرح جو بچے اپنی خوشی اور شوق سے دینی تعلیم کی طرف آئیں گے، وہی مستقبل میں کچھ کر کے دکھائیں گے اور جو مارے بندھے آئیں گے، وہ بہت کم سیکھ سکیں گے۔ دینی مدارس کو بھی چاہیے کہ وہ اس نقطہ نظر سے اپنے طلبہ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیں اور جن طلبہ میں دینی تعلیم کا رجحان نہ دیکھیں، انہیں مدرسے سے فارغ کر دیں کیونکہ جو بچہ کسی مضمون میں شوق و دلچسپی نہ رکھتا ہو، وہ کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

خلاصہ:

دینی مدارس کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ جدید علوم کی ہیئت اجتماعی کسی بھی نوعیت کی ہو، یہ بات حقیقت ہے کہ دینی مدارس کے اثرات کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ آج کی دنیا میں جس قدر جدید ٹیکنالوجی نے اپنے ڈیرے جمار کھیں ہیں اُس لحاظ سے دینی مدارس کی شہرت اور اثرات کو قبول کرنا ایک جدید محقق کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ البتہ زمینی حقائق اور دینی مدارس کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد ایک محقق کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کہیں نہ کہیں دینی مدارس کے اثرات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے یہ بات وثوق کے درجہ کو پہنچتی ہے کہ دینی علوم کے اثرات عصری علوم پر بہت زیادہ حاوی نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ مقالہ ہذا میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ زیرِ نظر مقالہ اس بات کی وضاحت کے لئے تحریر کیا گیا ہے کہ دینی مدارس کے اثرات بہت جامع اور وسیع ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں دینی مدارس اور وہاں پر دی جانے والی تعلیم، نیز ان مدارس سے فارغ التحصیل شخصیات کے اثرات موجود ہیں۔ اس بات سے کوئی بھی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر مسلم دُنیا میں تو دینی مدارس کے عمومی اثرات بہت واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱) جان آر شمٹ، گرہ کھلتی ہے، جہاد کے دور کا پاکستان، (مترجم: اعزاز یاقر) مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۹۶

۲) عبدالستار چودھری، طالبان اور بے نظیر بھٹو کی سرپرستی، پناہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۰

۳) جان آر شمٹ، گرہ کھلتی ہے، جہاد کے دور کا پاکستان، (مترجم: اعزاز یاقر) مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۱۰۷

۴) سلیم منصور خالد، دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات، النبی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز عالمی ادارہ فکر اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص:۳۴

۵) سید ابوالحسن علی ندوی، مدارس اسلامیہ کا مقام اور کام، معہد الامام ابی الحسن علی الندوی للدعوۃ والفکر الاسلامی، لکھنو، ۲۰۰۲ء، ص:۸

۶) سورہ زاریات، آیت:۵۶، پیر کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، ج۴، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۶۳۹، ۶۴۰

۷) ابی عبداللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، باب: فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم الحدیث:۲۲۴، ج۱، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیۃ، بیروت، س ن، ص:۱۸

۸) مولانا اشرف علی تھانوی، حقوق العلم، مطبع احمدی لکھنو، ۱۳۳۲ھ، ص:۵۲

۹) سید ابوالحسن ندوی، مدارس اسلامیہ، اہمیت، ضرورت اور مقاصد، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی، ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۰۱۲ء، ص:۲۱

۱۰) مولانا مناظر احسن گیلانی، الفرقان، الاداۃ گیلانی، نمبر ۱۸۸، بحوالہ فتاوی رحیمیہ، ص:۳۹

۱۱) محمود علی شرقاوی، عالمی تہذیب و ثقافت پر اسلام کے اثرات، (مترجم: صہیب عالم)، مکتبہ قاسم العلوم، لاہور، س ن، ص:۲۱، ۲۲

۱۲) عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، س ن، ص:۱۸۶

۱۳) ڈاکٹر زبید احمد، عربی ادبیات میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ، (مترجم: شاہد حسین رزاقی)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص:۱۱

۱۴) پروفیسر بختیار حسین صدیقی، برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳

۱۵) مولانا ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص:۴۰، ۳۶، ۴۵

۱۶) سید اوصاف علی، عابد رضا بیدار، عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، رامپور رضا لائبریری ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص:۱۱

۱۷) امام غزالی، احیاء علوم الدین، ج۱، مکتبہ و مطبعہ کریاطہ فوتر اسمارانگ، س ن، ص:۶

۱۸) سورہ جمعہ، آیت:۲، عمادالدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج۴ (مترجم: پیر محمد کرم شاہ الازہری)، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص:۶۱۶

۱۹) مولانا امین احسن اصلاحی، تزکیہ نفس، ج۱، ملک سنز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء، ص:۷۱

۲۰) مالک بن انس، الموطا، کتاب القرآن، باب: ماجاء فی القرآن، حدیث:۱۱، ج۱، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۶ھ بمطابق ۱۹۸۵ء، ص:۲۰۵

۲۱) ابی عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، البیان والتبیین، ج۲، مکتبۃ الخانجی بالقاہرۃ، ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۸ء، ص:۴۹

۲۲) ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، ج۷، الطبعۃ الاولی، بمطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ الکائنۃ فی الہند، ۱۳۲۶ھ، ص:۳۵

۲۳) ڈاکٹر احمد شلبی، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۱۰۲

— محمد رشید رضا، تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، دار الفضیلۃ للنشر والتوزیع والتصدیر، القاہرۃ، ۱۴۲۷ھ بمطابق ۲۰۰۶ء، ص:۲۱۸

۲۴) مولانا ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یوپی، طبع جدید، ۲۰۱۴ء، ص:۲۷، ۳۱

(۲۵　شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ج ۳، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یوپی، ص: ۱۲۸

(۲۶　ایضاً، ص: ۱۲۳

(۲۷　سید مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ج ۲، دار العلوم دیوبند، س ن، ص: ۲۱۸

(۲۸　ایضاً، ص: ۲۷۹

(۲۹)　ایضاً، ۲۸۹

(۳۰　شبلی نعمانی، مقالات شبلی، محولہ بالا، ص: ۱۱۰، ۱۱۱

(۳۱　مولانا ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، ارشد بک سیلرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۳۷

(۳۲　مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ج ۲، محولہ بالا، ص: ۲۹۳

(۳۳　مولانا کے الفاظ یہ ہیں: "علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں وہ مقصد کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں، پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے وہ بھی ناقص ہے۔"

(۳۴　مولانا زین العابدین سجاد، ہندوستان کے عربی مدارس اور ان کے نصاب تعلیم پر ایک نظر، در مجلہ "اسلام اور عصر جدید" دہلی جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۳۱

(۳۵　اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ج ۱۲، ص ۹۸۴

(۳۶　مجلہ 'القاسم' دیوبند کا دار العلوم نمبر: محرم ، ج ۷ ۱۳۳۳ھ، ص ۴

(۳۷　مولانا زین العابدین سجاد، ہندوستان کے عربی مدارس... در مجلہ "اسلام اور عصر جدید" دہلی جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۴

(۳۸　مولانا محمد طیب، دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، ص: ۱۳۷۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، برساتی ہندوستان اور مدارس دار العلوم دیوبند، در سہ ماہی المعارف شمارہ جنوری تا مارچ اور اپریل تا جون ۱۹۶۸ء

(۳۹　ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور جدید تقاضے المحمود اکیڈمی لاہور ۱۹۹۵ء

سہ ماہی، "الشریعہ" گوجرانوالہ کا خصوصی شمارہ، جولائی ۱۹۹۸ء

(۴۰　ابن خلدون، مقدمہ، فصل فی ابطال الفلسفہ

(۴۱　مجدد الف ثانی، مکتوبات، دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۶۶ نیز دفتر سوم مکتوب ۲۳

(۴۲　غزالی، احیاء علوم الدین، طبع قاہرہ، ج ۳، ص ۲۰۱

(۴۳　غلام علی آزاد، مآثر الکرام، ص ۸۹، ۸۳

(۴۴　ابن خلدون، مقدمہ طبع قاہرہ، ۱۳۸۲ھ (باب ششم، فصل ۲۹)، ج ۳، ص: ۱۲۳۹ھ